اگر میں شعر نہ کہتا
عباس تابش
انتخاب: سالم سلیم
ساقی ارباب ذوق
0305 6406067
PDF Book Company

اگر میں شعر نہ کہتا

○

سکوتِ دہر رگوں تک اتر گیا ہوتا
اگر میں شعر نہ کہتا تو مر گیا ہوتا

اگر میں شعر نہ کہتا

عباس تابش

انتخاب: سالم سلیم

الحمد پبلی کیشنز ®

رانا چیمبرز۔ (چوک پرانی انارکلی)۔ لیک روڈ۔ لاہور

☎ 37231490 - 37310944

ہماری کتابیں .....

خُوبصورت ، معیاری اور

کم قیمت کتابیں

تزئین واہتمام اشاعت

صفدر حسین

alhamd_publication@yahoo.com
www.facebook.com/alhamdpublication

ضابطہ:-

اشاعت	: 2022ء
مطبع	: شرکت پرنٹنگ پریس، لاہور
کمپوزنگ	: محمد عاطف سعید
قیمت	: 500روپے
	20ڈالر

انتساب

ڈاکٹر یاسین عاطؔر

کے نام

فہرست

عباس تابشؔ کا شعری منطقہ

عباس تابش اردو شاعری کے عصریٔ منظرنامے پر تخلیقی وفور اور فن کارانہ ہنرمندی کے ایک نہایت روشن استعارے کی صورت نظر آتے ہیں، جنھوں نے ایک دنیا کو اپنا گرویدہ کر رکھا ہے۔ وہ شعروسخن کے سنجیدہ و متین حلقوں اور اعلیٰ تنقیدی فہم کے لیے تو ایک گہرے تخلیقی فن کار کی حیثیت سے معروف ہیں ہی، عوامی سماعتوں اور مشاعروں پر بھی ان کا اقتدار مسلّم ہے۔ لیکن اس دیار میں بھی انھوں نے اپنے لہجے کی متانت اور اظہار کے سلیقے سے کوئی سمجھوتا نہیں کیا۔

عباس تابش نے اپنا شعری محاورہ پرندوں، درختوں، ندیوں اور اطراف میں پھیلی چھوٹی چھوٹی چیزوں سے خلق کیا ہے۔ بظاہر یہ منظر ہماری مصروف زندگی میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا مگر زندگی کے نامیاتی تصور سے ہی ایک ہمہ آہنگ شعری شعور پیدا ہوتا ہے۔

یار اک بار پرندوں کو حکومت دے دو
یہ کسی شہر کو جنگل نہیں ہونے دیں گے

ہم ہیں سوکھے ہوئے تالاب پہ بیٹھے ہوئے ہنس
جو تعلق کو نبھاتے ہوئے مر جاتے ہیں

اسی لیے میں پرندوں سے دور بھاگتا ہوں
کہ ان میں رہ کے مرے پر نکلتے ہیں

چلتے رہنے دو میاں سلسلہ دلداری کا
عاشقی دین نہیں ہے کہ مکمل ہو جائے

غیر مانوس سی خوشبو سے لگا ہے مجھ کو
تو نے یہ ہاتھ کہیں اور ملایا ہوا ہے

اگر رکھا گیا یوں ہی مجھے اکیلے میں
برآمد اور کوئی اس مکان میں ہوگا

اس کتاب میں شاعر قاری کو اپنی حیرت سرا کی سیر کراتا ہے، بلکہ دعوت دیتا ہے کہ اس حیرت کدے میں کچھ دن قیام بھی کرے۔

عباس تابش کی شاعری میں فقر و غنا کا عنصر ایک پس منظری آہنگ کی طرح گونجتا محسوس ہوتا ہے۔ یہ فقیری اوڑھی ہوئی نہیں ہے بلکہ ایک زندہ تجربہ ہے، جو ان کے حِسّی نظام میں سرایت کر گیا ہے۔

غزلیہ شاعری میں بے جا قسم کی بھاری بھرکم خیال آرائی یا فلسفہ طرازی کی کوئی گنجائش نہیں۔ عباس تابش کا شعری پیکر کائنات کی ازلی حرکت اور انسانی تجربے کے تار و پود سے ترتیب پاتا ہے۔ یہ ایک معصوم سا اظہار ہے کہ ان کی تخلیقی بازگشت قاری کو بہائے لیے چلی جاتی ہے۔

جدید یا مابعد جدید شعری استعارہ کلاسیکی رسومات کو نبھائے بغیر نہیں برتا جا سکتا۔ عصری شعری رجحان کے پیشِ نظر یہ بات پوری وضاحت سے محسوس کی جا سکتی ہے کہ شاعر محض نیا لفظ برتنے کی کوشش میں اپنے تخلیقی و شعری تجربے کو کہیں پیچھے چھوڑ دیتا ہے۔ لفظوں کی قدرے کمزور اور نامانوس فضا ہوتی ہے جس کی بنیاد پر وہ اپنا شعری اظہار کرتا ہے۔ مجھے کہنے دیجیے کہ عباس تابش نے بھی مابعد جدید بلکہ جدید تر شعر کہے ہیں اور ان کا بیانیہ جدید شعری محاورہ سے قریب بھی ہے، مگر ان کی غزلوں میں نمایاں طور پر کلاسیکی طرزِ اظہار کی بوباس پائی جاتی ہے۔

یہ ہم جو تجھے جاتا ہوا دیکھ رہے ہیں
ایسے تو چلی جائے گی بینائی ہماری

جو قاری کلاسیکی شاعری کا ذرا بھی شعور اور تجربہ رکھتا ہے وہ درج بالا اشعار کا لطف اٹھائے بغیر نہیں رہ سکتا۔

اندر کی شکست و ریخت، عشق کی تیز آنچ، دنیا کو ایک قلندر کی آنکھ سے دیکھنے کا رویہ، وہ عناصر ہیں جن سے عباس تابش کا شعری منطقہ ترتیب پاتا ہے۔

'اگر میں شعر نہ کہتا' کے انتخاب کے مختلف مراحل سے گذرتے ہوئے میں نے ان کے تمام شعری مجموعے دیکھے۔ جگہ جگہ مجھ پر بھی وہی کیفیت طاری ہوئی جو ان کی شاعری کے بنیادی تجربے کا خاصہ ہے۔ جذب و سرور کی اس منزل پر آ کر ہی شاعر کہہ سکتا ہے کہ:

''اگر میں شعر نہ کہتا تو مر گیا ہوتا' '

سالم سلیم
(دہلی)

○

دشت میں پیاس بجھاتے ہوئے مر جاتے ہیں
ہم پرندے کہیں جاتے ہوئے مر جاتے ہیں

ہم ہیں سوکھے ہوئے تالاب پہ بیٹھے ہوئے ہنس
جو تعلق کو نبھاتے ہوئے مر جاتے ہیں

گھر پہنچتا ہے کوئی اور ہمارے جیسا
ہم ترے شہر سے جاتے ہوئے مر جاتے ہیں

کس طرح لوگ چلے جاتے ہیں اُٹھ کر چپ چاپ
ہم تو یہ دھیان میں لاتے ہوئے مر جاتے ہیں

اُن کے بھی قتل کا الزام ہمارے سر ہے
جو ہمیں زہر پلاتے ہوئے مر جاتے ہیں

یہ محبت کی کہانی نہیں مرتی لیکن
لوگ کردار نبھاتے ہوئے مر جاتے ہیں

ہم ہیں وہ ٹوٹی ہوئی کشتیوں والے تابشؔ
جو کناروں کو ملاتے ہوئے مر جاتے ہیں

O

پانی آنکھ میں بھر کر لایا جا سکتا ہے
اب بھی جلتا شہر بچایا جا سکتا ہے

ایک محبت اور وہ بھی ناکام محبت
لیکن اس سے کام چلایا جا سکتا ہے

دل پر پانی پینے آتی ہیں اُمیدیں
اس چشمے میں زہر ملایا جا سکتا ہے

مجھ گمنام سے پوچھتے ہیں فرہاد و مجنوں
عشق میں کتنا نام کمایا جا سکتا ہے

یہ مہتاب یہ رات کی پیشانی کا گھاؤ
ایسا زخم تو دل پر کھایا جا سکتا ہے

پھٹا پرانا خواب ہے میرا پھر بھی تابشؔ
اس میں اپنا آپ چھپایا جا سکتا ہے

○

ہنسنے نہیں دیتا کبھی رونے نہیں دیتا
یہ دل تو کوئی کام بھی ہونے نہیں دیتا

تم مانگ رہے ہو مرے دل سے مری خواہش
بچہ تو کبھی اپنے کھلونے نہیں دیتا

میں آپ اٹھاتا ہوں شب و روز کی ذلت
یہ بوجھ کسی اور کو ڈھونے نہیں دیتا

وہ کون ہے اس سے تو میں واقف بھی نہیں ہوں
جو مجھ کو کسی اور کا ہونے نہیں دیتا

○

یہ عجب ساعتِ رخصت ہے کہ ڈر لگتا ہے
شہر کا شہر مجھے رختِ سفر لگتا ہے

ہم کو دل نے نہیں حالات نے نزدیک کیا
دھوپ میں دور سے ہر شخص شجر لگتا ہے

جس پہ چلتے ہوئے سوچا تھا کہ لوٹ آؤں گا
اب وہ رستہ بھی مجھے شہر بدر لگتا ہے

مجھ سے تو دل بھی محبت میں نہیں خرچ ہوا
تم تو کہتے تھے کہ اس کام میں گھر لگتا ہے

وقت لفظوں سے بنائی ہوئی چادر جیسا
اوڑھ لیتا ہوں تو سب خوابِ ہنر لگتا ہے

ایک مدت سے مری ماں نہیں سوئی تابشؔ
میں نے اک بار کہا تھا مجھے ڈر لگتا ہے

○

میری تنہائی بڑھاتے ہیں چلے جاتے ہیں
ہنس تالاب پہ آتے ہیں چلے جاتے ہیں

اس لیے اب میں کسی کو نہیں جانے دیتا
جو مجھے چھوڑ کے جاتے ہیں چلے جاتے ہیں

میری آنکھوں سے بہا کرتی ہے اُن کی خوشبو
رفتگاں خواب میں آتے ہیں چلے جاتے ہیں

شادیِ مرگ کا ماحول بنا رہتا ہے
آپ آتے ہیں، رُلاتے ہیں، چلے جاتے ہیں

کب تمہیں عشق پہ مجبور کیا ہے ہم نے
ہم تو بس یاد دلاتے ہیں چلے جاتے ہیں

آپ کو کون تماشائی سمجھتا ہے یہاں
آپ تو آگ لگاتے ہیں چلے جاتے ہیں

ہاتھ پتھر کو بڑھاؤں تو سگانِ دنیا
حیرتی بن کے دکھاتے ہیں چلے جاتے ہیں

○

پاؤں پڑتا ہوا رستہ نہیں دیکھا جاتا
جانے والے ترا جانا نہیں دیکھا جاتا

تیری مرضی ہے جدھر انگلی پکڑ کر لے جا
مجھ سے اب تیرے علاوہ نہیں دیکھا جاتا

یہ حسد ہے کہ محبت کی اجارہ داری
درمیاں اپنا بھی سایہ نہیں دیکھا جاتا

تو بھی اے شخص کہاں تک مجھے برداشت کرے
بار بار ایک ہی چہرہ نہیں دیکھا جاتا

یہ ترے چاہنے والے بھی عجب ہیں جاناں
عشق کرتے ہیں کہ ہوتا نہیں دیکھا جاتا

یہ ترے بعد کُھلا ہے کہ جدائی کیا ہے
مجھ سے اب کوئی اکیلا نہیں دیکھا جاتا

○

آنکھ پہ پٹی باندھ کے مجھ کو تنہا چھوڑ دیا ہے
یہ کس نے صحرا میں لا کر صحرا چھوڑ دیا ہے

جسم کی بوری سے باہر بھی کبھی نکل آؤں گا
ابھی تو اس پر خوش ہوں اس نے زندہ چھوڑ دیا ہے

ذہن مرا آزاد ہے لیکن دل کا دل مُٹھی میں
آدھا اُس نے قید رکھا ہے آدھا چھوڑ دیا ہے

جہاں دعا ملتی تھی اللہ جوڑی سلامت رکھے
میں نے تیرے بعد اُدھر سے گزرنا چھوڑ دیا ہے

چاروں شانے چت مٹی پر گرا پڑا ہوں تابشؔ
جانے کس نے دوسری جانب رستہ چھوڑ دیا ہے

○

دی ہے وحشت تو یہ وحشت ہی مسلسل ہو جائے
رقص کرتے ہوئے اطراف میں جنگل ہو جائے

اے مرے دشت مزاجو! یہ مری آنکھیں ہیں
اِن سے رومال بھی چھو جائے تو بادل ہو جائے

چلتا رہنے دو میاں سلسلہ دلداری کا
عاشقی دین نہیں ہے کہ مکمل ہو جائے

حالتِ ہجر میں جو رقص نہیں کر سکتا
اُس کے حق میں یہی بہتر ہے کہ پاگل ہو جائے

میرا دل بھی کسی آسیب زدہ گھر کی طرح
خود بخود کھلنے لگے خود ہی مقفل ہو جائے

ڈوبتی ناؤ میں سب چیخ رہے ہیں تابشؔ
اور مجھے فکر غزل میری مکمل ہو جائے

○

تیرے لیے سب چھوڑ کے تیرا نہ رہا میں
دنیا بھی گئی عشق میں تجھ سے بھی گیا میں

اک سوچ میں گم ہوں تری دیوار سے لگ کر
منزل پہ پہنچ کر بھی ٹھکانے نہ لگا میں

ورنہ کوئی کب گالیاں دیتا ہے کسی کو
یہ اس کا کرم ہے کہ تجھے یاد رہا میں

میں تیز ہوا میں بھی بگولے کی طرح تھا
آیا تھا مجھے طیش مگر جھوم اٹھا میں

اس درجہ مجھے کھوکھلا کر رکھا تھا غم نے
لگتا تھا گیا، اب کے گیا، اب کے گیا میں

یہ دیکھ مرا ہاتھ مرے خون سے تر ہے
خوش ہو کہ ترا مدِمقابل نہ رہا میں

اک دھوکے میں دنیا نے مری رائے طلب کی
کہتے تھے کہ پتھر ہوں مگر بول پڑا میں

اب طیش میں آتے ہی پکڑ لیتا ہوں پاؤں
اس عشق سے پہلے کبھی ایسا تو نہ تھا میں

○

کوئی ملتا نہیں یہ بوجھ اُٹھانے کے لیے
شام بے چین ہے سورج کو گرانے کے لیے

اپنے ہمزاد درختوں میں کھڑا سوچتا ہوں
میں تو آیا تھا انہیں آگ لگانے کے لیے

میں نے تو جسم کی دیوار ہی ڈھائی ہے فقط
قبر تک کھودتے ہیں لوگ خزانے کے لیے

دو پلک بیچ کبھی راہ نہ پائی ورنہ
میں نے کوشش تو بہت کی نظر آنے کے لیے

لفظ تو لفظ یہاں دھوپ نکل آتی ہے
تیری آواز کی بارش میں نہانے کے لیے

کس طرح ترکِ تعلق کا میں سوچوں تابشؔ
ہاتھ کو کاٹنا پڑتا ہے چُھڑانے کے لیے

○

بہت بیکار موسم ہے مگر کچھ کام کرنا ہے
کہ تازہ زخم ملنے تک پرانا زخم بھرنا ہے

ابھی سادہ ورق پر نام تیرا لکھ کے بیٹھا ہوں
ابھی اس میں مہک آنی ہے، تتلی نے اترنا ہے

بڑھے جو حبس تو شاخیں ہلا دینا کہ اب ہم کو
ہوا کے ساتھ جینا ہے، ہوا کے ساتھ مرنا ہے

مبادا اس کو دقت ہو نشانے تک پہنچنے میں
سو میں نے پھول سے دیوار کے رخنے کو بھرنا ہے

یہی اک شغل رکھنا ہے اذیت کے دنوں میں بھی
کسی کو بھول جانا ہے کسی کو یاد کرنا ہے

کوئی چہرہ نہ بن پایا مقدر کی لکیروں سے
سو اب اپنی ہتھیلی میں مجھے خود رنگ بھرنا ہے

کوئی رستہ ملے کیونکر مرے پائے خجالت کو
یہاں تو پاؤں دھرنا بھی کوئی الزام دھرنا ہے

وہ ہر لمحہ دعا دیتے ہیں لمبی عمر کی تابشؔ
مجھے لگتا ہے پیاروں کو بھی رخصت میں نے کرنا ہے

○

بیٹھتا اٹھتا تھا میں یاروں کے بیچ
ہو گیا دیوار دیواروں کے بیچ

جانتا ہوں کیسے ہوتی ہے سحر
زندگی کاٹی ہے بیماروں کے بیچ

میرے اس کوشش میں بازو کٹ گئے
چاہتا تھا صلح تلواروں کے بیچ

وہ جو میرے گھر میں ہوتا تھا کبھی
اب وہ سناٹا ہے بازاروں کے بیچ

تم نے چھوڑا تو مجھے یہ طائراں
بھر کے لے جائیں گے منقاروں کے بیچ

تجھ کو بھی اس کا کوئی احساس ہے
تیری خاطر ٹھن گئی یاروں کے بیچ

○

کوئی ٹکرا کے سُبک سر بھی تو ہو سکتا ہے
میری تعمیر میں پتھر بھی تو ہو سکتا ہے

کیوں نہ اے شخص! تجھے ہاتھ لگا کر دیکھوں
تُو مرے وہم سے بڑھ کر بھی تو ہو سکتا ہے

تُو ہی تُو ہے تو پھر اے جملہ جمالِ دنیا
تیرا شک اور کسی پر بھی تو ہو سکتا ہے

یہ جو ہے پھول ہتھیلی پہ اسے پھول نہ جان
میرا دل جسم سے باہر بھی تو ہو سکتا ہے

شاخ پر بیٹھے پرندے کو اڑانے والے
پیڑ کے ہاتھ میں پتھر بھی تو ہو سکتا ہے

کیا ضروری ہے کہ باہر ہی نمو ہو میری
میرا کھِلنا مرے اندر بھی تو ہو سکتا ہے

یہ جو ہے ریت کا ٹیلہ مرے قدموں کے تلے
کوئی دم میں مرے اوپر بھی تو ہو سکتا ہے

کیا ضروری ہے کہ ہم ہار کے جیتیں تابشؔ
عشق کا کھیل برابر بھی تو ہو سکتا ہے

○

نہ تجھ سے ہے نہ گلہ آسمان سے ہو گا
تری جدائی کا جھگڑا جہان سے ہو گا

تمہارے میرے تعلق کا لوگ پوچھتے ہیں
کہ جیسے فیصلہ میرے بیان سے ہو گا

اگر یونہی مجھے رکھا گیا اکیلے میں
برآمد اور کوئی اس مکان سے ہو گا

جدائی طے تھی مگر یہ کبھی نہ سوچا تھا
کہ تُو جدا بھی جداگانہ شان سے ہو گا

گزر رہے ہیں مرے دن اسی تفاخر میں
کہ اگلا قیس مرے خاندان سے ہو گا

○

یاد کر کر کے اُسے وقت گزارا جائے
کس کو فرصت ہے وہاں کون دوبارہ جائے

شک سا ہوتا ہے ہر اک پر کہ کہیں تو ہی نہ ہو
اب ترے نام سے کس کس کو پکارا جائے

سائرہ تجھ کو بہت یاد ہیں اُس کی باتیں
کیوں نہ کچھ وقت ترے ساتھ گزارا جائے

جس طرح پیڑ کو بڑھنے نہیں دیتی کوئی بیل
کیا ضروری ہے مجھے گھیر کے مارا جائے

عین ممکن ہے کہ ہو اس سے علاجِ وحشت
شہر میں زور سے اک نام پکارا جائے

اُس حسیں شخص کی خاطر جو کہا ہے تابشؔ
کم ہے اُس شعر کو جتنا بھی سنوارا جائے

○

کھا کے سوکھی روٹیاں پانی کے ساتھ
جی رہا تھا کتنی آسانی کے ساتھ

یوں بھی منظر کو نیا کرتا ہوں میں
دیکھتا ہوں اس کو حیرانی کے ساتھ

گھر میں اک تصویر جنگل کی بھی ہے
رابطہ رہتا ہے ویرانی کے ساتھ

آنکھ کی تہ میں کوئی صحرا نہ ہو
آ رہی ہے ریت بھی پانی کے ساتھ

زندگی کا مسئلہ کچھ اور ہے
شعر کہہ لیتا ہوں آسانی کے ساتھ

○

وہ آنے والا نہیں پھر بھی آنا چاہتا ہے
مگر وہ کوئی مناسب بہانا چاہتا ہے

یہ زندگی ہے، یہ تُو ہے، یہ روزگار کے دکھ
ابھی بتا دے کہاں آزمانا چاہتا ہے

کہ جیسے اس سے ملاقات پھر نہیں ہو گی
وہ ساری باتیں اکٹھی بتانا چاہتا ہے

میں سن رہا ہوں اندھیرے میں آہٹیں کیسی
یہ کون آیا ہے اور کون جانا چاہتا ہے

اسے خبر ہے کہ مجنوں کو راس ہے جنگل
وہ میرے گھر میں بھی پودے لگانا چاہتا ہے

وہ خود غرض ہے محبت کے باب میں تابشؔ
کہ ایک پل کے عوض اک زمانہ چاہتا ہے

○

وہ چاند ہو کہ چاند سا چہرہ، کوئی تو ہو
ان کھڑکیوں کے پار تماشا کوئی تو ہو

لوگو! اسی گلی میں مری عمر کٹ گئی
مجھ کو گلی میں جاننے والا کوئی، تو ہو

مجھ کو تو اپنی ذات کا اثبات چاہیے
ہوتا ہے اور میرے علاوہ کوئی تو ہو

جس سمت جایئے وہی دریا ہے سامنے
اس شہر سے فرار کا رستہ کوئی تو ہو

اپنے سوا بھی میں کوئی آواز سن سکوں
وہ برگِ خشک ہو کہ پرندہ کوئی تو ہو

یوں ہی خیال آتا ہے بانہوں کو دیکھ کر
ان ٹہنیوں پہ جھولنے والا کوئی تو ہو

ہم اِس اُدھیڑ بُن میں محبت نہ کر سکے
ایسا کوئی نہیں مگر ایسا کوئی تو ہو

مشکل نہیں ہے عشق کا میدان مارنا
لیکن ہماری طرح نہتا کوئی تو ہو

○

ٹوٹ جانے میں کھلونوں کی طرح ہوتا ہے
آدمی عشق میں بچوں کی طرح ہوتا ہے

اس لیے مجھ کو پسند آتا ہے صحرا کا سکُوت
اس کا نشہ تری باتوں کی طرح ہوتا ہے

ہم جسے عشق میں دیتے ہیں خدا کا منصب
پہلے پہلے ہمیں لوگوں کی طرح ہوتا ہے

جس سے بنتا ہو تعلق وہی ظالم پہلے
غیر ہوتا ہے نہ اپنوں کی طرح ہوتا ہے

چاندنی رات میں سڑکوں پہ قدم مت رکھنا
شہر جاگے ہوئے ناگوں کی طرح ہوتا ہے

بس یہی دیکھنے کو جاگتے ہیں شہر کے لوگ
آسماں کب تری آنکھوں کی طرح ہوتا ہے

اس سے کہنا کہ وہ ساون میں نہ گھر سے نکلے
حافظہ عشق کا سانپوں کی طرح ہوتا ہے

اس کی آنکھوں میں اُمڈ آتے ہیں آنسو تابشؔ
وہ جدا چاہنے والوں کی طرح ہوتا ہے

○

ایسے تو کوئی ترکِ سکونت نہیں کرتا
ہجرت وہی کرتا ہے جو بیعت نہیں کرتا

یہ لوگ مجھے کس لیے دوزخ سے ڈرائیں
میں عاشقی کرتا ہوں عبادت نہیں کرتا

ہم سلسلہ داروں کے ہو کیوں جان کے در پے
کافر اُسے کہیے جو محبت نہیں کرتا

لگتا ہے یہاں موت نہیں آنی کسی کو
اِس شہر میں اب کوئی وصیت نہیں کرتا

یہ مجھ کو بتاتے ہیں غزالانِ طرح دار
اچھا وہی رہتا ہے جو وحشت نہیں کرتا

تاؔبش کا قیامت سے یقیں اُٹھ نہ گیا ہو
کچھ دن سے وہ ذکرِ قد و قامت نہیں کرتا

○

چاند کو تالاب مجھ کو خواب واپس کر دیا
دن ڈھلے سورج نے سب اسباب واپس کر دیا

اس طرح بچھڑا کہ اگلی رونقیں پھر آ گئیں
اس نے میرا حلقۂ احباب واپس کر دیا

پھر بھٹکتا پھر رہا ہے کوئی برجِ دل کے پاس
کس کو اے چشمِ ستارہ یاب واپس کر دیا

میں نے آنکھوں کے کنارے بھی نہ تر ہونے دیئے
جس طرف سے آیا تھا سیلاب واپس کر دیا

جانے کس دیوار سے ٹکرا کے لوٹ آیا ہے گیند
جانے کس دیوار نے مہتاب واپس کر دیا

پھر تو اس کی یاد بھی رکھی نہ میں نے اپنے پاس
جب کیا واپس تو کل اسباب واپس کر دیا

التجائیں کر کے مانگی تھی محبت کی کسک
بے دلی نے یہ غمِ نایاب واپس کر دیا

○

مکاں بھر ہم کو ویرانی بہت ہے
مگر یہ دل کہ سیلانی بہت ہے

ہمارے پاؤں الٹے ہیں سو ہم کو
پلٹ جانے میں آسانی بہت ہے

ستارے چور آنکھوں سے نہ دیکھیں
زمیں پر میری نگرانی بہت ہے

ابھی سوکھی نہیں مٹی کی آنکھیں
ابھی دریاؤں میں پانی بہت ہے

عجب سی شرط ہے یہ زندگی بھی
جو منوائی ہے کم مانی بہت ہے

ضرورت ہی نہیں دشمن کی تابشؔ
مجھے میری تن آسانی بہت ہے

○

تیری آنکھوں سے اپنی طرف دیکھنا بھی اکارت گیا
یعنی پہچان کا یہ نیا سلسلہ بھی اکارت گیا

یوں حنائی لکیریں اُڑیں اجنبی طائروں کی طرح
پر بریدہ سا رنگِ کفِ صد حنا بھی اکارت گیا

اب کھلا ہے کہ میرا ترے رنگ میں تیرے انداز میں
بولنا ہی نہیں دیکھنا سوچنا بھی اکارت گیا

سن رہا ہوں ابھی تک میں اپنی ہی آواز کی بازگشت
یعنی اس دشت میں زور سے بولنا بھی اکارت گیا

وہ زلیخائی خواہش ہی اپنے سبب سے پشیماں نہ تھی
ساتویں در کے اندر مرا حوصلہ بھی اکارت گیا

کوئی لو تک نہ دی کالے پیڑوں کو اس آتشیں رقص نے
یعنی جنگل میں اس مور کا ناچنا بھی اکارت گیا

○

راتیں گزارنے کو تری رہ گزر کے ساتھ
گھر سے نکل پڑا ہوں میں دیوار و در کے ساتھ

دستک نے ایسا حشر اٹھایا کہ دیر تک
لرزاں رہا ہے جسم بھی زنجیرِ در کے ساتھ

کشکول تھامتے ہیں کفِ اعتبار سے
کرتے ہیں ہم گداگری لیکن ہنر کے ساتھ

اب کس طرح یہ ٹوکری سر پر اٹھاؤں میں
سورج پڑا ہوا ہے مرے بام و در کے ساتھ

سورج اسی طرح ہے یہ مہتاب اسی طرح
ڈھلتے رہے ہیں یار ہی شام و سحر کے ساتھ

یوں ہے مری اُڑان پہ بھاری مرا وجود!
جیسے زمیں بندھی ہو مرے بال و پر کے ساتھ

تابشؔ مجھے سفر کی روایت کا پاس تھا
سو میں بھی رہ بنا کے چلا رہِ گزر کے ساتھ

○

فقط مال و زرِ دیوار و در اچھا نہیں لگتا
جہاں بچے نہیں ہوتے وہ گھر اچھا نہیں لگتا

مرے دکھ تک مرے خون اور پسینے کی کمائی ہیں
تمہیں کیوں میری محنت کا ثمر اچھا نہیں لگتا

شکستہ سطر چاہے رنگ و بوئے پیرہن ٹھہرے
کسی صورت مجھے عجزِ ہنر اچھا نہیں لگتا

میسر ہو نہ جب تک بوئے تازہ تر کی ہمراہی
ہوا کی طرح گلیوں سے گزر اچھا نہیں لگتا

رہِ تیشہ طلب! تیری میں وہ دیوار ہوں جس کو
نہ ہو شوریدگی جس میں وہ سر اچھا نہیں لگتا

گلی میں کھیلتے بچوں کے ہاتھوں کا میں پتھر ہوں
مجھے اس صحن کا خالی شجر اچھا نہیں لگتا

چمکتا ہوں ہر اک مہتاب رُو کے روئے روشن میں
میں سورج ہوں مجھے شب کا سفر اچھا نہیں لگتا

جسے دیکھیں وہی پھر دیکھنے کی آرزو ٹھہرے
جسے چاہیں وہی بارِ دگر اچھا نہیں لگتا

اسی خاطر اسے تابشؔ اچکنا چاہتا ہوں میں
مجھے تالاب کی تہ میں قمر اچھا نہیں لگتا

○

مہ رخ جو گھروں سے کبھی باہر نکل آئے
پس منظرِ شب سے کئی منظر نکل آئے

تم اپنی زبانوں سے اسے چاٹتے رہنا
کیا جانیے دیوار میں کب در نکل آئے

کیا ان کو ڈبوئے کسی دریا کی روانی
یہ شہر تو کوزے کے سمندر نکل آئے

دن بھر تو رہے مہرِ جہاں تاب کی صورت
جب رات پڑی بھیس بدل کر نکل آئے

آئے ہیں اگرچہ کئی چہروں سے الجھ کر
لگتا ہے کہ ہم آنکھ بچا کر نکل آئے

آواز تو دو پرتوِ مہتاب کو تابش
ممکن ہے وہ تالاب سے باہر نکل آئے

○

سانس کے ہمراہ شعلے کی لپک آنے کو ہے
ایسا لگتا ہے کوئی روشن مہک آنے کو ہے

پھر پسِ پسپائی میرا حوصلہ زندہ ہوا
آسماں سے پھر کوئی تازہ کمک آنے کو ہے

ایک خلقت ہی نہیں ہے بدگمانی کا شکار
اس کی جانب سے مرے بھی دل میں شک آنے کو ہے

ایک مدت سے چراغِ سرد سا رکھا ہوں میں
اس توقع پر کہ آنچل کی بھڑک آنے کو ہے

اے سفر کی رائیگانی آیتوں کے ساتھ چل
پھر وہی جنگل، وہی سونی سڑک آنے کو ہے

بیدِ مجنوں ہو رہے ہیں تیر کیا تلوار کیا
میرے دشمن میں بھی اب شاید لچک آنے کو ہے

اب تو اس چھت پر کوئی ماہِ شبانہ چاہیے
سایۂ قامت فصیلِ شام تک آنے کو ہے

راستے گم ہو رہے ہیں دھند کی پہنائی میں
سردیوں کی شام ہے پھر اس کا چک آنے کو ہے

○

ایک مشکل سی بہر طور بنی ہوتی ہے
تجھ سے باز آئیں تو پھر خود سے ٹھنی ہوتی ہے

کچھ تو لے بیٹھتی ہے اپنی شکستہ پائی
اور کچھ راہ میں چھاؤں بھی گھنی ہوتی ہے

میرے سینے سے ذرا کان لگا کر دیکھو
سانس چلتی ہے کہ زنجیر زنی ہوتی ہے

آبلہ پائی بھی ہوتی ہے مقدر اپنا
سر پہ افلاک کی چادر بھی تنی ہوتی ہے

دودھ کی نہر نکالی ہے غموں سے ہم نے
ہم بتا سکتے ہیں کیا کوہ کنی ہوتی ہے

آنکھ تو کھلتی ہے کرنوں کی طلب میں لیکن
زیبِ مژگاں کسی نیزے کی انی ہوتی ہے

دشتِ غربت ہی پہ موقوف نہیں ہے تابشؔ
اب تو گھر میں بھی غریب الوطنی ہوتی ہے

○

دہن کھولیں گی اپنا سیپیاں آہستہ آہستہ
گزر دریا سے اے ابرِ رواں آہستہ آہستہ

لہو تو عشق کے آغاز ہی میں جلنے لگتا ہے
مگر ہونٹوں تک آتا ہے دھواں آہستہ آہستہ

پلٹنا بھی اگر چاہیں پلٹ کر جا نہیں سکتے
کہاں سے چل کے ہم آئے کہاں آہستہ آہستہ

کہیں لالی بھری تھالی نہ گر جائے سمندر میں
چلا ہے شام کا سورج کہاں آہستہ آہستہ

ابھی اس دھوپ کی چھتری تلے کچھ پھول کھلنے دو
زمیں بدلے گی اپنا آسماں آہستہ آہستہ

کسے اب ٹوٹ کے رونے کی فرصت کارِ دنیا میں
چلی جاتی ہے اک رسمِ فغاں آہستہ آہستہ

مرے دل میں کسی حسرت کے پس انداز ہونے تک
نمٹ ہی جائے گا کارِ جہاں آہستہ آہستہ

مکیں جب نیند کے سائے میں ستانے لگیں تابشؔ
سفر کرتے ہیں بستی کے مکاں آہستہ آہستہ

○

کس کر باندھی گئی رگوں میں دل کی گرہ تو ڈھیلی ہے
اس کو دیکھ کے جی بھر آنا کتنی بڑی تبدیلی ہے

زندہ رہنے کی خواہش میں دم دم لو دے اٹھتا ہوں
مجھ میں سانس رگڑ کھاتی ہے یا ماچس کی تیلی ہے

ان آنکھوں میں کودنے والو تم کو اتنا دھیان رہے
وہ جھیلیں پایاب ہیں لیکن ان کی تہ پتھریلی ہے

کتنی صدیاں سورج چمکا کتنے دوزخ آگ جلی
مجھے بنانے والے میری مٹی اب تک گیلی ہے

زندہ ہوں تو مجھے بتائیں نیلے ہونٹوں والے لوگ
میرا کیسا رنگ کرے گی بات جو میں نے پی لی ہے

ممکن ہے اب وقت کی چادر پر میں کروں رفو کا کام
جوتے میں نے گانٹھ لیے ہیں گدڑی میں نے سی لی ہے

○

تیری روح میں سناٹا ہے اور مری آواز میں چپ
تُو اپنے انداز میں چپ ہے، میں اپنے انداز میں چپ

گاہے گاہے سانسوں کی آواز سنائی دیتی ہے
گاہے گاہے بج اٹھتی ہے دل کے شکستہ ساز میں چپ

سناٹے کے زہر میں بجھتے لوگوں کو یہ کون بتائے
جتنا اونچا بول رہے ہیں اتنی ہے آواز میں چپ

اک مدت سے خشک پڑا ہے وہ جھرنا انگڑائی کا
جانے کس نے بھر دی ہے اس پیکرِ نغمہ ساز میں چپ

رگ رگ میں جب خون کی بوندیں بلبل بن کر چہک اٹھیں
پھر دل حافظ کیونکر سادھے سینے کے شیراز میں چپ

○

یہ کس کے خوف کا گلیوں میں زہر پھیل گیا
کہ ایک نعش کے مانند شہر پھیل گیا

نہیں گرفت میں تاحدِ خاک کا منظر
سمٹ گئیں مری بانہیں کہ دہر پھیل گیا

تجھے قریب سمجھتے تھے گھر میں بیٹھے ہوئے
تری تلاش میں نکلے تو شہر پھیل گیا

میں جس طرف بھی چلا جاؤں جان سے جاؤں
بچھڑ کے تجھ سے تو لگتا ہے دہر پھیل گیا

مکاں مکان سے نکلا کہ جیسے بات سے بات
مثالِ قصۂ ہجراں یہ شہر پھیل گیا

بچا نہ کوئی تری دھوپ کی تمازت سے
ترا جمال بہ اندازِ قہر پھیل گیا

یہ موج موج بنی کس کی شکل سی تابش
یہ کون ڈوب کے بھی لہر لہر پھیل گیا

O

جھلمل سے کیا ربط نکالیں کشتی کی تقدیروں کا
تارے کشف نہیں کر سکتے بے آواز جزیروں کا

ہر ناکامی نے ایسے بھی کچھ دیواریں کھینچی ہیں
اک بے نقشہ شہر بنا ہے لاحاصل تدبیروں کا

اک مدت سے قریۂ جاں میں جھڑتے ہیں جھنکار کے پھول
جیسے میرے جسم کے اندر موسم ہو زنجیروں کا

دور سے جھنڈ پرندوں کا لگتے ہیں خیمے والوں کو
کس انداز کا آنا ہے یہ آگ چھڑکتے تیروں کا

رات گئے جب تارے بھی کچھ بے معنی سے لگتے ہیں
ایک دبستاں کھلتا ہے ان آنکھوں کی تفسیروں کا

ایک ہتھیلی پر اس نے مہکائے حنا کے سندر پھول
ایک ہتھیلی کی قسمت میں لکھا دشت لکیروں کا

○

نگاہِ اوّلیں کا ہے تقاضا دیکھتے رہنا
کہ جس کو دیکھنا اس کو ہمیشہ دیکھتے رہنا

نہ مجھ کو نیند آتی ہے نہ دل سے بات جاتی ہے
یہ کس نے کہہ دیا مجھ سے کہ رستہ دیکھتے رہنا

ابھی اچھے نہیں لگتے جنوں کے پیچ و خم اس کو
کبھی اس رہ سے گزرے گی یہ دنیا دیکھتے رہنا

دیئے کی لو نہ بن جائے طنابِ سرسری اس کی
میں دریا کی طرف جاتا ہوں خیمہ دیکھتے رہنا

کوئی چہرہ ہی ممکن ہے تمہارے جی کو لگ جائے
تماشا دیکھنے والو تماشا دیکھتے رہنا

کہ اب تو دیکھنے میں بھی ہیں کچھ محویتیں ایسی
کہیں پتھر نہ کر ڈالے یہ میرا دیکھتے رہنا

سرشکِ خوں کبھی مژگاں تلک آیا نہیں پھر بھی
کنارے آ لگے شاید یہ دریا دیکھتے رہنا

نگاہ سرسری تابشؔ محیطِ حسن کیا ہو گی
جہاں تک دیکھنے کا ہو تقاضا دیکھتے رہنا

○

صدائے ذات کے اونچے حصار میں گم ہے
وہ خامشی کا مسافر پکار میں گم ہے

وہ شہرِ شب کے کنارے چراغ جلتا ہے
کہ کوئی صبح مرے انتظار میں گم ہے

یہ کہہ رہی ہیں کسی کی جھکی جھکی آنکھیں
بدن کی آنچ نظر کے خُمار میں گم ہے

ہر ایک سمت سے اس کو صدائیں آتی ہیں
مجھے پکار کے خود بھی پکار میں گم ہے

نئے چراغ جلا مجھ کو ڈھونڈنے والے
تری نظر تو نظر کے غُبار میں گم ہے

○

بچپن کا دور عہدِ جوانی میں کھو گیا
یہ امرِ واقعہ بھی کہانی میں کھو گیا

لہروں میں کوئی نقشہ کہاں پائیدار ہے
سورج کے بعد چاند بھی پانی میں کھو گیا

آنکھوں تک آ سکی نہ کبھی آنسوؤں کی لہر
یہ قافلہ بھی نقل مکانی میں کھو گیا

اب بستیاں ہیں کس کے تعاقب میں رات دن
دریا تو آپ اپنی روانی میں کھو گیا

تابشؔ کا کیا کہیں کہ وہ زہرہ گداز شخص
آتش فشاں کا پھول تھا پانی میں کھو گیا

○

اِک قدم تیغ پہ اور ایک شرر پر رکھا
میری وحشت نے مجھے رقصِ دگر پر رکھا

میرے مالک نے تجھے آئینہ داری دے کر
نگراں تجھ کو مرے حسنِ نظر پر رکھا

لاتعلق نظر آتا تھا بظاہر لیکن
شہر کو اُس نے مری خیر خبر پر رکھا

زندگی! تُو نے قدم موڑ دیئے اور طرف
اور اندر سے مجھے اور سفر پر رکھا

اہلِ وحشت کو مگر کون بتاتا جا کر
ہو گیا نافِ غزالیں کوئی گھر پر رکھا

کونپلیں پھوٹ پڑیں دستِ دُعا سے میرے
دمِ آمین جو میں دیدۂ تر پر رکھا

ختم ہوتی ہی نہیں گریہ و زاری اُن کی
میرؔ نے ہاتھ تو ہر لفظ کے سر پر رکھا

میں نے اِس ڈر سے اُسے توڑ لیا ہے تابشؔ
سوکھ جائے نہ کہیں شاخِ شجر پر رکھا

○

مکاں بھر ہم کو ویرانی بہت ہے
مگر یہ دل کہ سیلانی بہت ہے

ہمارے پاؤں الٹے ہیں سو ہم کو
پلٹ جانے میں آسانی بہت ہے

ستارے چور آنکھوں سے نہ دیکھیں
زمیں پر میری نگرانی بہت ہے

ابھی سوکھی نہیں مٹی کی آنکھیں
ابھی دریاؤں میں پانی بہت ہے

عجب سی شرط ہے یہ زندگی بھی
جو منوائی ہے کم مانی بہت ہے

ضرورت ہی نہیں دشمن کی تابشؔ
مجھے میری تن آسانی بہت ہے

○
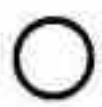
طلسمِ خواب سے میرا بدن پتھر نہیں ہوتا
مری جب آنکھ کھلتی ہے میں بستر پر نہیں ہوتا

یقیں آتا نہیں تو مجھ کو یا مہتاب کو دیکھو
کہ رات اس کی بھی کٹ جاتی ہے جس کا گھر نہیں ہوتا

جدھر دیکھوں ادھر ہی دیکھتا رہتا ہوں پہروں تک
مجھے اطراف کا خالی ورق ازبر نہیں ہوتا

کھجوریں اور پانی لے کے آگے بڑھتا جاتا ہوں
مگر یہ کوہِ امکاں ہے کہ مجھ سے سر نہیں ہوتا

کم از کم مجھ سے دنیا کو شکایت تو نہیں ہو گی
میں اس جیسا ہی بن جاؤں اگر بہتر نہیں ہوتا

جواز اپنا بناتا ہوں کسی نادیدہ خطے میں
جہاں میری ضرورت ہو وہاں اکثر نہیں ہوتا

گلہ تو خیر کیا ہو گا بس اتنا تم سے کہنا ہے
تمہاری عمر میں کوئی ستم پرور نہیں ہوتا

تو پھر یوں ہے کہ میں نے اس کو چاہا ہی نہیں تابشؔ
اگر اس کی شباہت کا گماں مجھ پر نہیں ہوتا

○

سانس کے شور کو جھنکار نہ سمجھا جائے
ہم کو اندر سے گرفتار نہ سمجھا جائے

اس کو رستے سے ہٹانے کا یہ مطلب تو نہیں
کسی دیوار کو دیوار نہ سمجھا جائے

میں کسی اور حوالے سے اسے دیکھتا ہوں
مجھ کو دنیا کا طرف دار نہ سمجھا جائے

یہ زمیں تو ہے کسی کاغذی کشتی جیسی
بیٹھ جاتا ہوں اگر بار نہ سمجھا جائے

اس کو عادت ہے گھنے پیڑ میں سو جانے کی
چاند کو دیدۂ بیدار نہ سمجھا جائے

اپنی باتوں پہ وہ قائم نہیں رہتا تابشؔ
اس کے انکار کو انکار نہ سمجھا جائے

○

شاید کسی بلا کا تھا سایہ درخت پر
چڑیوں نے رات شور مچایا درخت پر

موسم تمہارے ساتھ کا جانے کدھر گیا
تم آئے اور بور نہ آیا درخت پر

دیکھا نہ جائے دھوپ میں جلتا ہوا کوئی
میرا جو بس چلے کروں سایہ درخت پر

سب چھوڑے جا رہے تھے سفر کی نشانیاں
میں نے بھی ایک نقش بنایا درخت پر

اب کے بہار آئی ہے شاید غلط جگہ
جو زخم دل پہ آنا تھا آیا درخت پر

ہم دونوں اپنے اپنے گھروں میں مقیم ہیں
پڑتا نہیں درخت کا سایہ درخت پر

○

عجیب طور کی ہے اب کے سرگرانی مری
میں تجھ کو یاد بھی کر لوں تو مہربانی مری

میں اپنے آپ میں گہرا اتر گیا شاید
مرے سفر سے الگ ہو گئی روانی مری

بس ایک موڑ مری زندگی میں آیا تھا
پھر اس کے بعد الجھتی گئی کہانی مری

تباہ ہو کے بھی رہتا ہے دل کو دھڑکا سا
کہ رائیگاں نہ چلی جائے رائیگانی مری

میں اپنے بعد بہت یاد آیا کرتا ہوں
تم اپنے پاس نہ رکھنا کوئی نشانی مری

○

ہوائے تیز ترا ایک کام آخری ہے
کہ نخلِ خشک پہ ماہِ تمام آخری ہے

میں جس سکون سے بیٹھا ہوں اس کنارے پر
سکوں سے لگتا ہے میرا قیام آخری ہے

پھر اس کے بعد یہ بازارِ دل نہیں لگنا
خرید لیجئے صاحب! غلام آخری ہے

گزر چلا ہوں کسی کو یقیں دلاتا ہوا
کہ لوحِ دل پہ رقم ہے جو نام آخری ہے

تبھی تو پیڑ کی آنکھوں میں چاند بھر آیا
کسی نے کہہ دیا ہوگا کہ شام آخری ہے

یہ لگ رہا ہے محبت کے پہلے زینے پر
کہ جس مقام پہ ہوں یہ مقام آخری ہے

کسی نے پھر سے کھڑے کر دیے درو دیوار
خیال تھا کہ مرا انہدام آخری ہے

ہمارے جیسے وہاں کس شمار میں ہوں گے
کہ جس قطار میں مجنوں کا نام آخری ہے

شروعِ عشق میں ایسی اداسیاں تابشؔ
ہر ایک شام یہ لگتا ہے شام آخری ہے

○

اتنا آساں نہیں مسند پہ بٹھایا گیا میں
شہرِ تہمت تری گلیوں میں پھرایا گیا میں

میرے ہونے سے یہاں آئی ہے پانی کی بہار
شاخِ گریہ تھا سرِ دشت لگایا گیا میں

یہ تو اب عشق میں جی لگنے لگا ہے کچھ کچھ
اس طرف پہلے پہل گھیر کے لایا گیا میں

خوف اتنا تھا کہ دیوار پکڑ کر نکلا
اُس سے ملنے کے لیے صورتِ سایہ گیا میں

تجھ سے کچھ کہنے کی ہمت ہی نہیں تھی ورنہ
ایک مدت تری دہلیز تک آیا گیا میں

خلوتِ خاص میں بلوانے سے پہلے تابشؔ
عام لوگوں میں بہت دیر بٹھایا گیا میں

○

ڈوب کر بھی نہ پڑا فرق گراں جانی میں
میں ہوں پتھر کی طرح بہتے ہوئے پانی میں

یہ محبت تو بہت بعد کا قِصّہ ہے میاں
میں نے اُس ہاتھ کو پکڑا تھا پریشانی میں

رفتگاں! تم نے عبث ڈھونگ رچایا ورنہ
عشق کو دخل نہیں موت کی ارزانی میں

یہ محبت بھی ولایت کی طرح رکھتی ہے
حالتِ حال میں یا حالتِ حیرانی میں

اس لیے جل کے کبھی راکھ نہیں ہوتا دل
یہ کبھی آگ میں ہوتا ہے کبھی پانی میں

اک محبت ہی پہ موقوف نہیں ہے تابشؔ
کچھ بڑے فیصلے ہو جاتے ہیں نادانی میں

○

پسِ دعا نہ رہیں کیوں اُداسیاں میری
حجاب ہیں مرے منہ پر ہتھیلیاں میری

مجھے یہ ڈر ہے کوئی کاٹ کر نہ لے جائے
بہشتِ خواب سے باہر ہیں ٹہنیاں میری

بس اتنا حِصّہ ہے میرا مکانِ ہستی میں
فصیل اور کسی کی ہے کھڑکیاں میری

ابھی نہ ڈال بڑھاپے کی ظلمتوں میں مجھے
ابھی نہ اور بجھا موم بتیاں میری

اور اب تو ڈور بنا کر لہو کے مانجھے سے
بسنت رُت نے اڑا دی ہیں دھجیاں میری

میں دم بخود گلِ نغمہ ہوں شاخِ ہستی کا
ہوا چلے تو بکھرتی ہیں پتیاں میری

نہ جانے کون مرا کھو گیا ہے مٹی میں
زمیں کریدتی رہتی ہیں انگلیاں میری

○

ابھی سے لائے ہو کیوں دل کی راہ پر اس کو
بھٹکنے دینا تھا کچھ دن اِدھر اُدھر اس کو

کبھی فصیل سے باہر کبھی فصیل کے بیچ
تلاش کرتی پھری شاخِ بے ثمر اس کو

وہ مشتِ خاک کہ اڑنے سے آشنا ہی نہ تھی
لگا دیے ہیں تمنا نے بال و پر اس کو

نہ جانے کب وہ مجھے چھوڑ کر چلا جائے
میں زندگی کی طرح کر چکا بسر اس کو

اس اختصار کی تفصیل کون دیکھے گا
بکھر گیا ہوں میں کتنا سمیٹ کر اس کو

نہ خواب ہی سے جگایا نہ انتظار کیا
ہم اس دفعہ بھی چلے آئے چوم کر اس کو

وہ جس کا نام بھی سننا ہمیں پسند نہ تھا
کیا ہے روز کے جھگڑوں نے معتبر اس کو

چلا گیا تھا وہ کشتی میں بیٹھ کر تابشؔ
ہوا ہے شہر میں کیا' اس کی کیا خبر اس کو

○

اسی لیے تو یہ شامیں اجڑنے لگتی ہیں
کہ لو بڑھا کے ہوائیں سکڑنے لگتی ہیں

میں کیسے اپنے توازن کو برقرار رکھوں
قدم جماؤں تو سانسیں اکھڑنے لگتی ہیں

یونہی نہیں مجھے دریا کو دیکھنے سے گریز
سنا ہے پانی میں شکلیں بگڑنے لگتی ہیں

اسی لیے تو ہوا اپنے گھر نہیں جاتی
کہ اس کے بعد یہ گلیاں اجڑنے لگتی ہیں

رہیں خموش تو ہونٹوں سے خوں ٹپکتا ہے
کریں کلام تو کھالیں ادھڑنے لگتی ہیں

اڑا نہ دوں تو گرفتارِ آئینہ ہو کر
خود اپنے آپ سے چڑیاں جھگڑنے لگتی ہیں

اگر میں سانس بھی آہستہ سے نہ لوں تابشؔ
مرے بدن میں دراڑیں سی پڑنے لگتی ہیں

○

بچھڑ کے ہم سے جو کھوئے گئے ہیں راہ کے بیچ
سحر ہوئے انہیں دیکھو گے خیمہ گاہ کے بیچ

ہم ایک دوجے سے ملنے کا ڈھنگ بھول گئے
یہ سانحہ بھی ہوا شہرِ داد خواہ کے بیچ

کہاں وہ لوگ جنہیں جنگلوں میں شام ہوئی
کہاں وہ اشک کہ ٹھہرے رہے نگاہ کے بیچ

میں کیسے مان لوں تیری کہ اس دفعہ بھی مجھے
مفاہمت نظر آتی ہے انتباہ کے بیچ

کسی نے مجھ کو پکارا ہے میرے لہجے میں
یہ اتفاق بھی اکثر ہوا ہے راہ کے بیچ

وہ ساتھ ساتھ رہا بوئے گلستاں کی طرح
گھمایا اس نے بہت دل کی سیر گاہ کے بیچ

کھلا کہ گنبد گردوں کے ہم مجاور ہیں
جب ایک عمر گزار آئے خانقاہ کے بیچ

○

دل دکھوں کے حصار میں آیا
جبر کب اختیار میں آیا

دے اسے بھی فروغِ حسن کی بھیک
دل بھی لگ کر قطار میں آیا

خوب ہے یہ اکائی بھی لیکن
جو مزہ انتشار میں آیا

دیکھتا ہے نہ پوچھتا ہے کوئی
اجنبی! کس دیار میں آیا؟

یہ تو جانیں مقدروں والے
کون کس کے مدار میں آیا

شاخ پر ایک پھول بھی تابشؔ
مجھ سے ملنے بہار میں آیا

○

یہ ہم کو کون سی دنیا کی دھن آوارہ رکھتی ہے
کہ خود ثابت قدم رہ کر ہمیں سیارہ رکھتی ہے

اگر بجھنے لگیں ہم تو ہوائے شامِ تنہائی
کسی محراب میں جا کر ہمیں دوبارہ رکھتی ہے

چلو ہم دھوپ جیسے لوگ ہی اس کو نکال آئیں
سنا ہے وہ ندی تہ میں کوئی مہ پارہ رکھتی ہے

ہمیں کس کام پر مامور کرتی ہے یہ دنیا بھی
کہ ترسیلِ غمِ دل کے لیے ہرکارہ رکھتی ہے

کبھی سر پھوڑنے دیتی نہیں دیوار سے تابشؔ
یہ کیا دیوانگی ہے جو ہمیں ناکارہ رکھتی ہے

○

یہ بادلوں میں ستارے ابھرتے جاتے ہیں
کہ آسماں کو پرندے کترتے جاتے ہیں

تمہارے شہر میں تہمت ہے زندہ رہنا بھی
جنہیں عزیز تھیں جانیں وہ مرتے جاتے ہیں

نہ جانے کب تمہیں فرصت ملے گی آنے کی
تمہارے آنے کے دن تو گزرتے جاتے ہیں

کہا تو یہ تھا کہ چھوڑیں انا کی مسند کو
مگر یہ لوگ تو دل سے اترتے جاتے ہیں

کہاں سے آئی ہے تابشؔ یہ سرپھری آندھی
کہ جس قدر بھی دیئے تھے بکھرتے جاتے ہیں

○

یہ کرشمے بھی ہوئے حسن کی بوچھاروں سے
پیڑ بن کر بدن اُگنے لگے دیواروں سے

کیوں نہ بے قامتیٔ خاک پہ رونا آئے
جھک کے ملتا ہے فلک شہر کے میناروں سے

کس کی باتوں نے گلے چھید دیئے ہیں اپنے
گردنیں ہم تو بچا لائے تھے تلواروں سے

یہ دکانیں تو انہیں روکتی رہ جاتی ہیں
جانے کیوں لوگ گزر جاتے ہیں بازاروں سے

پھر مجھے آنے لگا ترکِ سکونت کا خیال
ندیاں جیسے اتر آئی ہوں کہساروں سے

تُو نے ان کو کسی قابل ہی نہ سمجھا ورنہ
حرمتِ عشق تھی سب تیرے گنہگاروں سے

آ پڑی صحن میں کیوں اس کی ضرورت تابشؔ
وہ تو کہتا تھا کہ گھر بنتے ہیں دیواروں سے

○

چاند نے ابر میں چہرے کو چھپا رکھا ہے
شاید اس گھر کے دریچے میں دیا رکھا ہے

ایک دھن ہے جو شب و روز رواں رکھتی ہے
ورنہ اپنا تو ہر اک کام کیا رکھا ہے

جاگ جائے نہ کہیں چاند کی آہٹ سن کر
لوریاں دے کے سمندر کو سلا رکھا ہے

عرصۂ پیری ہے کیوں اگلے قدم کی ٹھوکر
پاؤں رکھا ہے کہ مٹی پہ عصا رکھا ہے

○

مجھ تہی جاں سے تجھے انکار پہلے تو نہ تھا
تیرا در میرے لیے دیوار پہلے تو نہ تھا

حسن نے سونپی ہے یہ کیسی نگوں ساری مجھے
میں کسی کا آئینہ بردار پہلے تو نہ تھا

اس طرح تو پا بجولاں ہم نہ پھرتے تھے کبھی
ان گلی کوچوں میں یہ بازار پہلے تو نہ تھا

اب کہاں سے آئی اس کافر کے دل میں روشنی
آئینہ حلقہ بگوشِ یار پہلے تو نہ تھا

تابشؔ اک دریوزہ گر کو باز رکھنے کے لیے
کوئی دروازہ پسِ دیوار پہلے تو نہ تھا

○

عشق ہی کارِ مسلسل ہو گیا
زندگی کا مسئلہ حل ہو گیا

میرے آنسو میرے اندر ہی گرے
رونے سے جی اور بوجھل ہو گیا

آسماں پہلے نہیں تھا بے ستوں
لیکن اب دستِ دُعا شل ہو گیا

میں نے بھی اس کو بھلایا اور پھر
خوش ہوا اتنا کہ پاگل ہو گیا

پانیوں پر آخری ہچکی کے ساتھ
ایک افسانہ مکمل ہو گیا

برف کے پیڑوں پہ پھول آنے لگے
رابطہ اس سے معطل ہو گیا

گھومتا پھرتا ہے تنہا رات کو
سردیوں کا چاند پاگل ہو گیا

تابشؔ اب تو سو ہی جانا چاہیے
سامنے کا گھر مقفل ہو گیا

○

ہمیں بچھاڑ کے کیا حیثیت تمہاری تھی
وہ جنگ تم بھی نہ جیتے جو ہم نے ہاری تھی

اور اب تمہیں بھی ہر اک شخص اچھا لگتا ہے
گئے دنوں میں یہی کیفیت ہماری تھی

ہمارے چہرے دمِ صبح دیکھتے آ کر
کہ ہم نے رات نہیں زندگی گزاری تھی

بچھڑ گیا وہ جدائی کے موڑ سے پہلے
کہ اس کے بعد محبت میں صرف خواری تھی

○

پھر بھٹکتا پھر رہا ہوں ہجر موسم کے لیے
یہ زیادہ کھو دیا میں نے کسی کم کے لیے

اس جہانِ خاک سے جو بھی تعلق ہو مرا
زندہ رہنا ہے مجھے اس ربطِ مبہم کے لیے

ایک ممنوعہ شجر کے ساتھ کاٹے زندگی
جرم جیسی یہ سزا ہے آلِ آدم کے لیے

اس کا مطلب ہے یہاں اب کوئی آئے گا ضرور
دم نکلنا چاہتا ہے خیر مقدم کے لیے

چھن رہی ہے دھوپ سی دیوارِ جاں کے اس طرف
میں بھی اب موزوں نہیں شاید ترے غم کے لیے

اس خزاں میں بھی وہی کاغذ کے پرزے جوڑ کر
اک شجر میں نے بنایا اپنے موسم کے لیے

خواب میرے یوں ہیں تابشؔ جس طرح پانی پہ ریت
یہ شگون اچھا نہیں ہے دیدۂ نم کے لیے

○

یہ شہر روز ہی بستا ہے روز اجڑتا ہے
مگر غنیم کو کیا اس سے فرق پڑتا ہے

خدا نے ہم میں یہ کیا قدر مشترک رکھی
کہ میری آنکھ، ترے لب سے پھول جھڑتا ہے

ہمارے ساتھ محبت کا جو سلوک بھی ہو
سوال یہ ہے کہ دنیا کا کیا بگڑتا ہے

شکستگی میں بھی معیار اپنے ہوتے ہیں
گرے مکان تو اپنے ہی پاؤں پڑتا ہے

یہی پسند نہیں ہے مجھے محبت میں
یہ روز روز جو دنیا سے کام پڑتا ہے

کچھ ایسی جم گئی سنجیدگی مرے رخ پر
کسی طرح سے یہ پتھر نہیں اکھڑتا ہے

ابھی جلے تھے، ابھی بجھ بجھا گئے تابشؔ
ہواؤں سے تو کوئی دم دیا بھی لڑتا ہے

○

بے صدا ٹھہرے ہونٹ کھول کے ہم
آ چکے تنگ بول بول کے ہم

سر پہ ماں کی دعا کا سایہ نہیں
گھر سے نکلے ہیں جھوٹ بول کے ہم

اپنے اندر بھی اک تماشا ہے
کیا کریں کھڑکیوں کو کھول کے ہم

نام اس کا لیا نہیں جاتا
بات کرتے ہیں ناپ تول کے ہم

وہ ملے گا مگر ملے گا کسے
اسے ڈھونڈیں گے خود کو رول کے ہم

شاید اپنی صدا سنائی دے
دیکھ لیتے ہیں اونچا بول کے ہم

جو ملا اُس پہ مرمٹے تابشؔ
کتنے اچھے تھے میل جول کے ہم

○

کون کہتا ہے کہ وہ بھولتا جاتا ہے مجھے
اپنا چہرہ نہ سہی رہ تو دکھاتا ہے مجھے

صبح کے ساتھ میں کھو جاتا ہوں بچے کی طرح
شام ہوتے ہی کوئی ڈھونڈ کے لاتا ہے مجھے

آپ کچھ اور بتاتے ہیں مرے بارے میں
آئینہ اور کوئی شکل دکھاتا ہے مجھے

آج اک عمر میں یہ بھید کھلا ہے مجھ پر
وہ کوئی اور نہیں ہے جو ڈراتا ہے مجھے

سرد مہری میں یہ سورج بھی ہے تیرے جیسا
دور ہی دور سے جو دیکھتا جاتا ہے مجھے

یہ نہ میں ہوں، نہ ہوا ہے، نہ قضا ہے تابشؔ
میرے لہجے میں کوئی اور بلاتا ہے مجھے

○

وہ بھولتا ہے نہ دل میں اتارتا ہے مجھے
ہمیشہ مار محبت کی مارتا ہے مجھے

میں اس کا لمحۂ موجود ہوں مگر وہ شخص
فضول وقت سمجھ کر گزارتا ہے مجھے

بظاہر ایسا نہیں پیڑ اس حویلی کا
ہوا چلے تو بہت پھول مارتا ہے مجھے

میں اس کے ہاتھ سے جاتا ہوں مال و زر کی طرح
وہ روز قرض سمجھ کر اتارتا ہے مجھے

○

دھندلی سمتوں میں اگر کونج کا پر مل جائے
پھر تو اے دربدری مجھ کو بھی گھر مل جائے

اور ہی رنگ میں ہو برگ و ثمر کا ہونا
جس کی خواہش ہے مجھے وہ بھی اگر مل جائے

منتظر جس کا ہوں وہ آئے ضروری تو نہیں
یہ بھی ممکن ہے کوئی اور خبر مل جائے

خاک و خواب ایک ہی تھیلی کے ہیں چٹے بٹے
دل کی مرضی ہے جدھر چاہے اُدھر مل جائے

اہتمام ایسا ہو فرصت کے دنوں میں دل کا
ایک ڈر ختم ہو اور دوسرا ڈر مل جائے

اس طرح سے نہ گزاروں گا یقیناً تجھ کو
زندگی تُو جو مجھے بارِ دگر مل جائے

○

یہ ہجر کا موسم بھی گزر کیوں نہیں جاتا
جاتا ہوا لگتا ہے مگر کیوں نہیں جاتا

بہتا ہوں تو میری کوئی گہرائی بھی ہو گی
دریا کی طرح خود میں اتر کیوں نہیں جاتا

لازم ہے کہ جاگے کبھی بچے کی طرح بھی
یہ شہر کسی خواب سے ڈر کیوں نہیں جاتا

ملبے سے نکل آتا ہے آسیب کی مانند
لوگوں کی طرح خوف بھی مر کیوں نہیں جاتا

اس کنج میں مدت سے بہار آئی نہیں ہے
یہ باغ مری آنکھ میں بھر کیوں نہیں جاتا

یہ بھید بھی کھلنے نہ دیا دربدری نے
گھر کے لیے جاتا ہوں تو گھر کیوں نہیں جاتا

ملبوس سے کیوں منتِ یکجائی ہے تابشؔ
میں ٹوٹ چکا ہوں تو بکھر کیوں نہیں جاتا

○
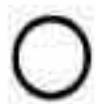
چمکے گا شجر پر نہ مرے گھر میں رہے گا
وہ چاند ہے اور چاند سمندر میں رہے گا

اب سانپ کے مانند مرے پیچھے پڑا ہے
شب کو یہی سایہ مرے پیکر میں رہے گا

خواہش کو خدا رزق بہم کرتا ہے دل میں
لگتا ہے یہ کیڑا اسی پتھر میں رہے گا

آئے ہیں تو ستا کے چلے جائیں گے پنچھی
وہ پیڑ اسی طرح اسی گھر میں رہے گا

تارے بھی تو محور سے نکل جاتے ہیں پیارے
آخر کوئی کب تک ترے چکر میں رہے گا

یہ عشق بھی رہتا نہیں لگتا مجھے تابشؔ
سر چڑھ کے جو بولے وہ کہاں سر میں رہے گا

○

آنکھ لگتے ہی مری نیند اڑانے لگ جائیں
خواب چڑیوں کی طرح شور مچانے لگ جائیں

ہم کہ گہرائی میں بہتے ہیں سمندر کی طرح
جانے کس وقت تری سطح پہ آنے لگ جائیں

یہ بھی ممکن ہے کوئی روکنے والا ہی نہ ہو
یہ بھی ممکن ہے یہاں مجھ کو زمانے لگ جائیں

اسی امید پہ گزرے کئی موسم خالی
شاید اس بار شجر بُور اٹھانے لگ جائیں

دیکھ اے حسنِ فراواں ! یہ بہت ممکن ہے
میرا دل تک نہ لگے تیرے خزانے لگ جائیں

کارِ دنیا بھی عجب ہے کہ مرے گھر والے
دن نکلتے ہی مری خیر منانے لگ جائیں

○

دہکتے دن میں عجب لطف اٹھایا کرتا تھا
میں اپنے ہاتھ کا تتلی پہ سایہ کرتا تھا

اگر میں پوچھتا بادل کدھر کو جاتے ہیں
جواب میں کوئی آنسو بہایا کرتا تھا

یہ چاند ضعف سے جس کی زباں نہیں کھلتی
کبھی یہ چاند کہانی سنایا کرتا تھا

میں اپنی ٹوٹتی آواز گانٹھنے کے لیے
کہیں سے لفظ کا پیوند لایا کرتا تھا

عجیب حسرتِ پرواز مجھ میں ہوتی تھی
میں کاپیوں میں پرندے بنایا کرتا تھا

تلاشِ رزق میں بھٹکے ہوئے پرندوں کو
میں جیب خرچ سے دانہ کھلایا کرتا تھا

ہمارے گھر کے قریب ایک جھیل ہوتی تھی
اور اس میں شام کو سورج نہایا کرتا تھا

یہ زندگی تو مجھے تیرے پاس لے آئی
یہ راستہ تو کہیں اور جایا کرتا تھا

○

جب انتظار کے لمحے پگھلنے لگتے ہیں
گلی کے لوگ مرے دل پہ چلنے لگتے ہیں

میں اس لیے بھی پرندوں سے دور بھاگتا ہوں
کہ ان میں رہ کے مرے پر نکلنے لگتے ہیں

کبھی کبھی کسی بچّے کی روح آتی ہے
کبھی کبھی مرے گھر گیند اچھلنے لگتے ہیں

عجیب پیڑ ہیں ان کو حیا نہیں آتی
ہمارے سامنے کپڑے بدلنے لگتے ہیں

وہ ہاتھ ہاتھ میں آنے کی دیر ہوتی ہے
ستارے اور کسی رُخ پہ چلنے لگتے ہیں

جب آسمان پہ تابش دھنک ابھرتی ہے
ہم اپنے ساتھ چھتوں پر ٹہلنے لگتے ہیں

○

دل بستگیٔ شوق کے سامان بندھے ہیں
گھر میں کہیں پنجرے کہیں گلدان بندھے ہیں

یہ اپنی محبت تو دکھاوے کے لیے ہے
ہم تم تو کہیں اور مری جان بندھے ہیں

اس عشق سے پہلے بھی کوئی اور نہیں تھا
ہم تجھ سے ترے ہجر کے دوران بندھے ہیں

تم کاٹ نہ دینا اسے بے کار سمجھ کر
اس پیڑ کے نیچے کئی پیمان بندھے ہیں

یہ ہم جو کسی طور نہیں کھلتے کسی پر
تجھ ہاتھ کی خاطر بہت آسان بندھے ہیں

خوشبو کے پرندوں کو رہائی نہ ملے گی
اب گل کی جگہ شاخ پہ زندان بندھے ہیں

عالم تھے کئی اور بھی مٹی کے علاوہ
کیا اس میں کشش تھی کہ یہاں آن بندھے ہیں

اس شہر کو معلوم ہے پرچم کی روایت
اس شہر میں نیزوں پہ گریبان بندھے ہیں

○

دکھوں کا دشت آنکھوں کا سمندر چھوڑ آیا ہوں
جو گھر میں لا نہ سکتا تھا وہ باہر چھوڑ آیا ہوں

تم اگلی بارشوں کے بعد جا کر دیکھنا پیارے
تمہارا نام دیواروں پہ لکھ کر چھوڑ آیا ہوں

محبت کی ہے اس گھر میں رہائش تو نہیں کی ہے
ابھی تو صرف دروازے پہ بستر چھوڑ آیا ہوں

تری بانہوں میں آ کر بھی یہی محسوس ہوتا ہے
کہ خود کو وقت کے رحم و کرم پر چھوڑ آیا ہوں

ابھی کچھ دیر میں پھیلے گی خوشبو ساری بستی میں
وہاں کے اک دریچے میں گُلِ تر چھوڑ آیا ہوں

خدانا خواستہ میں بھی اگر بن باس لوں تابشؔ
وہاں کس کو بتاؤں گا بھرا گھر چھوڑ آیا ہوں

○

جس طرح رنج میں آنکھوں کی نمی کا ہونا
ایسا ہوتا ہے محبت میں کسی کا ہونا

کیوں نہ پھر اس سے تعلق کو نبھایا جائے
جب کسی اور کا ہونا ہے اُسی کا ہونا

تیرا سورج کے قبیلے سے تعلق تو نہیں
یہ کہاں سے تجھے آیا ہے سبھی کا ہونا

منہ میں ابھرے ہوئے چھالے کی طرح ہے ترا نام
اِتنا آساں نہ سمجھ کم سخنی کا ہونا

عشق دیمک کی طرح چاٹ لیا کرتا ہے
اب ضروری نہیں آشفتہ سری کا ہونا

○

کیسا رنگ و روشنی کا قہر ہے
دن ڈھلے بھی شہر میں دوپہر ہے

آدمی اب بھاگ کر جائے کہاں
شہر کے چاروں طرف بھی شہر ہے

مرگیا ہے چاند بھی چڑیوں کے ساتھ
جھیل کے پانی میں کتنا زہر ہے

ہجر بھی پلکیں جھپکنے لگ گیا
عشق کی دنیا میں پچھلا پہر ہے

بس یہیں تک ہے یہ دریا خون کا
اس سے آگے تتلیوں کا شہر ہے

○

سار ی دنیا میں مرے جی کو لگا ایک ہی شخص
ایک ہی شخص تھا ایسا، بخدا ایک ہی شخص

درجۂ کفر سہی مدحِ جمالِ جاناں
دل کی پوچھو تو خدا سے بھی بنا ایک ہی شخص

ایسا لگتا ہے سبھی عشق کسی ایک سے تھے
ایسا لگتا ہے مجھے ملتا رہا ایک ہی شخص

وہ جو میں اُس کی محبت بھی کسی اور سے کی
ان دنوں شہر کا ہر شخص لگا ایک ہی شخص

میں تو اے عشق تری کوزہ گری جانتا ہوں
تُو نے ہم دو کو ملایا تو بنا ایک ہی شخص

مجھ سے ناراض نہ ہونا مرے اچھے لوگو!
کیا کروں میری محبت نے چنا ایک ہی شخص

تُو جو کہتا ہے ترے جیسے کئی اور بھی ہیں
تجھ کو دعویٰ ہے تو پھر خود سا دکھا ایک ہی شخص

تُو جسے چاہتا ہے میں بھی اُسے چاہتا ہوں
اچھا لگتا ہے مجھے تیرے سوا ایک ہی شخص

دوست! سب سے کہاں کھنچتا ہے غزل کا چلّہ
حجرۂ میرؔ میں ہوتا ہے سدا ایک ہی شخص

○

تیرا ہو کر کوئی کب تیرے سوا ہوتا ہے
تُو جو ہوتا ہے جُدا کس سے جدا ہوتا ہے

حالتِ حال چھپائی نہیں جاتی اُس سے
جب کوئی شخص تجھے سوچ رہا ہوتا ہے

کر رہا ہوتا ہوں میں اُس سے محبت لیکن
دل اُسے پا کے کہیں کھو بھی چکا ہوتا ہے

کس طلب سے تری آنکھوں کی طرف دیکھتا ہوں
جب ترے غم کا نشہ ٹوٹ رہا ہوتا ہے

راستہ روکتی خلقت تجھے معلوم نہیں
عشق میں ہارا ہوا شخص بلا ہوتا ہے

یوں ترے شہر میں گھبرایا ہوا پھرتا ہوں
جس طرح پہلے پہل عشق ہوا ہوتا ہے

کیا ستم ہے کہ لگاتا ہوں ترے نام وہ شعر
جو کسی اور کے ہجراں میں کہا ہوتا ہے

میں دلاتا ہوں یقیں اور کسی کو لیکن
دل کسی اور کے قدموں میں پڑا ہوتا ہے

کسی بے کس کا سہارا نہیں بنتی دنیا
اس کا ہوتا ہے کوئی جس کا خدا ہوتا ہے

لاکھ اڑاتا ہوا نکلے کوئی شہرت کا غبار
جو بھی ہوتا ہے ہوا میں وہ ہوا ہوتا ہے

وحیٔ بے لفظ سمجھ میں نہیں آنے والی
ورنہ طوفان کا چڑیوں کو پتہ ہوتا ہے

○

شامل مرے غبار میں صحرا اگر نہ ہو
مجھ سے تو اِک قدم بھی یہ وحشت بسر نہ ہو

کیسے وہ کوہسار کے دُکھ کو سمجھ سکے
چشمے پہ جس کو شائبہِ چشمِ تر نہ ہو

پتھر زمیں پہ پھینک کے چھینٹے اُڑاؤں میں
گر مجھ کو تیری جھیل سی آنکھوں کا ڈر نہ ہو

اپنے جمال پر اُسے پختہ یقیں بھی ہے
ڈرتا بھی ہے کہ یہ مرا حُسنِ نظر نہ ہو

تجھ سے نہیں ملا تھا مگر چاہتا تھا میں
تو ہم سفر ہو اور کہیں کا سفر نہ ہو

یہ کہہ کے میرے گھر سے فرشتے چلے گئے
وہ کوئی گھر ہے جس میں پرندوں کا گھر نہ ہو

دیدار چاہتا ہے تہجد گزارِ عشق
یارب! قبولیت کی گھڑی تک سحر نہ ہو

یہ شب، یہ دستکیں، یہ پرندوں کی قیل و قال
دروازہ کھولیے کہیں صبحِ سفر نہ ہو

تو جانتا نہیں مرے مالک مکان کو
اے دوست! کوئی چیز اِدھر کی اُدھر نہ ہو

تجھ سے بچھڑ کے اِس لیے تیرا ہے انتظار
وہ کوئی زندگی ہے جو بارِ دگر نہ ہو

آنکھوں کا کیا بنے گا ترے خال و خد کی خیر
اے دوست! زندگی سے زیادہ بسر نہ ہو

تابشؔ بزعمِ خود جنہیں عزت ہوئی نصیب
وہ چاہتے ہیں اور کوئی معتبر نہ ہو

○

جلا رہے گا اک دیا بجھے دیوں کے درمیاں
وہ ہاتھ ہاتھ میں رہے گا آندھیوں کے درمیاں

عجب طرح کے لوگ ہیں کہ ٹھیک توڑتے نہیں
مگر یہ مجھ کو ڈھونڈتے ہیں کرچیوں کے درمیاں

کسی میں اس کے خواب تھے کسی میں اس کے خال و خد
اُسے نہ میں بُھلا سکا محبتوں کے درمیاں

مکاں کے پائیں باغ میں سجا جمی تھی یاد کی
میں رات دیر تک رہا گئے ہوؤں کے درمیاں

چراغ جل رہا ہے اور جا رہے ہیں چھوڑ کر
یہ کس طرف کے لوگ ہیں مری صفوں کے درمیاں

وہ جس کے انتظار میں ہماری چوتھی پُشت ہے
وہ فیصلہ کبھی تو ہوگا ان بڑوں کے درمیاں

○

میرے اعصاب معطل نہیں ہونے دیں گے
یہ پرندے مجھے پاگل نہیں ہونے دیں گے

تُو خُدا ہونے کی کوشش تو کرے گا لیکن
ہم تجھے آنکھ سے اوجھل نہیں ہونے دیں گے

یہ جو اک بیل اداسی کی اُگی ہے گھر میں
ہم اسے پھیل کے جنگل نہیں ہونے دیں گے

یار ! اک بار پرندوں کو حکومت دے دو
یہ کسی شہر کو مقتل نہیں ہونے دیں گے

یہ جو چہرے ہیں یہاں چاند سے چہرے تابشؔ
یہ مرا عشق مکمل نہیں ہونے دیں گے

○

اِک چٹائی تھی مری ایک پیالہ تھا مرا
عام ہو کر بھی یہی خاص حوالہ تھا مرا

میں کہ نقصان کے مانند ملا تھا خود کو
عشق کرنا ہی مری جان ازالہ تھا مرا

اب تجھے یاد نہیں ہے تو دلا دیتا ہوں
اُن دنوں ایک جہاں جاننے والا تھا مرا

عشق نے ظلم کمانے کی اجازت ہی نہ دی
ورنہ یہ شہرِ ستم ایک نوالہ تھا مرا

مڑتے ہی دشت سے درگاہ کی جانب تابشؔ
چاند بھی چاند کہاں پاؤں کا چھالا تھا مرا

○

اُداس دل کے پاس انتظام کیسے آ گیا
یہ عین دوپہر میں وقتِ شام کیسے آ گیا

کنارِ جُو میں سو رہا تھا اپنا جال پھینک کر
مری گرفت میں مہِ تمام کیسے آ گیا

پلٹ پڑا ہوں میں تو اُن کو اس پہ اعتراض ہے
شفق کے پُھول توڑ کر غلام کیسے آ گیا

تو اتنی بات پر ہمارے پاؤں کاٹ دو گے تم
کہ پاشکستگاں کو یہ خرام کیسے آ گیا

میں آدھے راستے سے ہی پلٹ پڑا نہ ہوں کہیں
وگرنہ اُس طرف سے میں تمام کیسے آگیا

کھنچا نہیں ہے دار پر تو بات کیسے بن گئی
ہجوم سے نکل کے یہ غلام کیسے آگیا

O

غضب کریں گے ہمارا سکوت توڑیں گے
یہ سانحے تو گنہ گار کر کے چھوڑیں گے

دعائیں مانگنے والو ہمارے ساتھ چلو
ہم آج رات ندی میں چراغ چھوڑیں گے

نئے سرے سے تعلق نہیں بنائیں گے ہم
جہاں سے ٹوٹ گیا تھا وہیں سے جوڑیں گے

ہمارے بعد کوئی کیوں ہمارے جیسا ہو
ہم اپنا عشق کسی اور پر نہ چھوڑیں گے

میں دیکھتا ہوں ترے ہاتھ اور سوچتا ہوں
یہ میرے درد سے آسودگی نچوڑیں گے

○

کیوں کر دکھائی دیوے کوئی شرر ہمارا
اندر کی آگ پر ہے رقصِ دگر ہمارا

تسلیم کیجیے حق اُس شخص پر ہمارا
وہ عام ہے تو ہو گا، ہے خاص کر ہمارا

فرصت نہیں ہے یاراں دل کی طرف سے ہم کو
اس پائیں باغ میں ہے سیر و سفر ہمارا

تجھ گھر کے راستے میں ہم اپنے منتظر تھے
اے کاش اس طرف سے ہوتا گزر ہمارا

ہم خاک پر رہیں گے یا چاک پر رہیں گے
کیا فیصلہ کیا ہے اے کوزہ گر ہمارا

جب رات کی سیاہی پیڑوں پہ گر رہی تھی
جنگل سے ہو رہا تھا اُس دم گزر ہمارا

ہم دیکھ کر کسی کو دریا میں کود جائیں
اتنا بھی حق نہیں کیا اُس شخص پر ہمارا

مٹی کو گھولنے میں خود گُھل رہا ہے یعنی
توسیع چاہتا ہے دستِ ہنر ہمارا

نیزے کی نوک سے وہ مٹی میں ڈھونڈتے ہیں
ملتا نہیں ہے اُن کو مقتل میں سر ہمارا

جب بن گیا تو اس کی دنیا مثال دے گی
تعمیر ہو رہا ہے ملبے سے گھر ہمارا

اُس کو کھرچ رہے ہیں پتھر پہ کائی جیسے
پیروں پہ جم گیا ہے شوقِ سفر ہمارا

دونوں طرف سے ہم تو مجبور ہو گئے ہیں
کوئی اِدھر ہمارا کوئی اُدھر ہمارا

اک دوسرے سے جیسے پیوند ہو گئے ہوں
رکھا ہے ہاتھ کب سے اُس ہاتھ پر ہمارا

اب چوک میں پڑے ہیں ہم جنگلی کبوتر
غرفے کی جالیوں میں ہوتا تھا گھر ہمارا

اک دن کُھلے گا ہم پر گنجینۂ معانی
کشکول توڑ دے گا دستِ ہنر ہمارا

منہ موڑ لیں تو دنیا، دنیا نہیں رہے گی
دیکھا نہیں ہے اُس نے صرفِ نظر ہمارا

اب اپنے پاؤں اپنے دل پر پڑیں گے تابشؔ
اندر کی سمت ہو گا اگلا سفر ہمارا

○

میں اُس کی نامرادی کو غمِ حاصل سمجھتا ہوں
جسے منزل نہیں ملتی اُسے منزل سمجھتا ہوں

میں اپنی بات سے پھرتا نہیں خنجر کے پھرنے تک
جسے قاتل سمجھتا ہوں اُسے قاتل سمجھتا ہوں

طمانچے ایک دو میری طرف سے بھی مرے منہ پر
کہ خود کو آج کل میں بھی اِسی قابل سمجھتا ہوں

تم آئے ہو مگر مجھ پر گرانی کا یہ عالم ہے
تمہارے ہاتھ کو سینے پہ رکھی سِل سمجھتا ہوں

مجھے اُمید ہے پانی مرے گھر تک نہ آئے گا
شگافوں پر رکھے ہاتھوں کو میں ساحل سمجھتا ہوں

اگرچہ یہ اثر انداز ہوتی ہے مرے گھر پر
مگر میں اس اُداسی کو غذائے دل سمجھتا ہوں

تو کیا اے شخص تیری جستجو سے تھک چکا ہوں میں
کہ تو حاصل نہیں لیکن تجھے حاصل سمجھتا ہوں

○

ہم جڑے رہتے تھے آباد مکانوں کی طرح
اب یہ باتیں ہمیں لگتی ہیں فسانوں کی طرح

پیاس میں کھلتے ہوئے باغ کا کیا پوچھتے ہو
شاخ سے پھول نکلتے ہیں زبانوں کی طرح

میں تو اس شہر میں رکنے کے لیے آیا تھا
لیکن اس شہر کے رستے ہیں ڈھلانوں کی طرح

رات کو دیر سے لوٹوں تو محلّے کے مکان
گھورتے ہیں مجھے دشمن کے ٹھکانوں کی طرح

ماں کے ہوتے کبھی سوچا ہی نہیں تھا تابشؔ
گھر بکھر جائے گا تسبیح کے دانوں کی طرح

○

ہر ایک ہاتھ میں پتھر ہے کیا کیا جائے
یہ آئینے کا مقدر ہے کیا کیا جائے

میں جس کے ہجر سے محظوظ ہونا چاہتا ہوں
مجھے وہ شخص میسر ہے کیا کیا جائے

یہ تیرا ہاتھ نہیں ہے ہمارے شانے پر
کوئی نڈھال کبوتر ہے کیا کیا جائے

مرا گواہ نہیں بنتا اندرون مرا
یہی معاملہ باہر ہے کیا کیا جائے

تمہارا شہر تو عادی ہے جھوٹ سننے کا
ہمارے ہاتھ میں ساغر ہے کیا کیا جائے

○
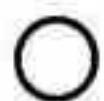
یہ اُس پہ ہے مجھے کتنا لہو لہو کرے گا
اُسی نے زخم دیئے ہیں وہی رفو کرے گا

میں اس خیال سے تالاب چھوڑ دیتا ہوں
کہ میرے بعد پرندہ یہاں وضو کرے گا

میں اس اُمید پہ دن بھر لکیر کھینچتا ہُوں
کہ چاند نکلے گا اور اِس کو آبجُو کرے گا

ترے سوا کوئی ہوتا تو اُس سے کہتے ہم
ہمارا کام ہے تجھ سے لہٰذا تُو کرے گا

یہ کوئی پھول نہیں ہے کہ شاخ پر آئے
میاں یہ ہجر ہے، رُخسار میں نمو کرے گا

○

مٹی مٹی ہو کر بھی وہ آنکھوں میں بھر آتے ہیں
کوہِ ندا کو جانے والے لوگ پلٹ کر آتے ہیں

اُن میں سرایت کر جاتا ہے یوں میرا پتھریلا پن
اب رُخساروں کے بدلے ہاتھوں میں پتھر آتے ہیں

کیا میری تنہائی نے ہر دوست کو تنہا کر ڈالا
وہ جو کبھی ملتے ہی نہ تھے وہ ملنے اکثر آتے ہیں

اِن مہمانوں کی خاطر دہلیز پہ بیٹھا رہتا ہوں
میرے گھر میں رزق آتا ہے اور کبوتر آتے ہیں

اور ہی دنیا کی خوشبو آتی ہے میرے زخموں سے
شام! ترے نوکیلے پنجے کس کو چُھو کر آتے ہیں

ناتا توڑنے والو تم سے جنگ نہیں کرنے کے ہم
تم بیٹھو ہم شعبِ ابی طالب سے ہو کر آتے ہیں

○
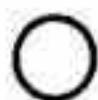
کچھ اس لیے بھی ہمارا نشانہ بنتا ہے
ہمارے سامنے آکر زمانہ بنتا ہے

ہمارے جسموں کی اینٹیں لگائی جاتی ہیں
ہمیں ٹھکانے لگا کر ٹھکانہ بنتا ہے

مری سزا بھی یہی ہے مری جزا بھی یہی
دُکھی نہ ہو کہ مرا دِل دُکھانا بنتا ہے

بہشتِ بوسہ اگر تجھ سے مانگتے ہیں ہم
ہم اہلِ عشق کا یہ محنتانہ بنتا ہے

کریں حساب تو پھر قیس کا زمانہ بھی
ہماری دربدری کا زمانہ بنتا ہے

حوالہ دیتا ہے مجنوں سفید بالوں کا
پُرانا ہے نہیں جتنا پُرانا بنتا ہے

کہ جیسے شاخ پہ پھول اور آسمان پہ چاند
کسی نے آنا ہو ایسے تو آنا بنتا ہے

بنانے والے کسی دن بنا بھی دے اُس کو
ترے حضور کوئی پنجگانہ بنتا ہے

○

اب کے ممکن ہے وہ چادر ہی فراہم ہو جائے
سر پہ باندھوں تو کفن، کھولوں تو پرچم ہو جائے

پھر سمجھنا کہ مجھے عشق نہیں ہے تجھ سے
تیرے ملنے سے اگر تیری کمی کم ہو جائے

اتنی شدت سے مرے زخم کے بارے میں نہ سوچ
یُوں نہ ہو گُھل کے ترا ہاتھ ہی مرہم ہو جائے

اپنے غصّے کو اگر ضبط میں کر لُوں تابشؔ
میری مُٹھی میں جو پتھر ہے وہ نیلم ہو جائے

○
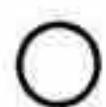
گزر رہی ہے اداسی کی شام کاغذ پر
میں آج رات کروں گا قیام کاغذ پر

میں لکھنا چاہتا ہوں اور یہ بھی چاہتا ہوں
کہ ہو نہ جائے مرا دکھ تمامؔ کاغذ پر

تمہاری یاد بھی کیا ہے کہ شام پڑتے ہی
پڑاؤ کرتی ہے دل میں، خرام کاغذ پر

بہت دنوں سے ادھر تتلیاں نہ آتی تھیں
میں لکھ کے بیٹھ گیا اس کا نام کاغذ پر

یہ میں جو تجھ سے طلب کر رہا ہوں شہپرِ نور
میں تیری بات نہ لکھوں گا عام کاغذ پر

کبھی تو دے اسے شفّاف پانیوں کا مقام
کبھی تو آ مرے ماہِ تمام کاغذ پر

یہ مصرعہ مصرعہ اداسی اتر رہی ہے یہاں
کہ اپنے پنکھ گراتی ہے شام کاغذ پر

O

میں جب بھی حرف کی حُجّت تمام کرنے لگا
سکوت پیڑ میں چُھپ کر کلام کرنے لگا

یہی تو مجھ سے غلط ہو گیا محبت میں
بنی نہ بات تو میں اہتمام کرنے لگا

گریز کرتے ہوئے اُس کے جی میں کیا آئی
کہ ایک دن وہ مرا احترام کرنے لگا

یہاں تو قبریں ہیں، قبروں کے سر نہیں ہوتے
تُو اپنی تیغ کہاں بے نیام کرنے لگا

○

خود کو بے شک مرے اعصاب پہ طاری نہ سمجھ
لیکن اے عشق مجھے عشق سے عاری نہ سمجھ

تجھ سے مانگا ہے ضرورت کے علاوہ تجھ کو
تُو مجھے دوست سمجھ دوست! بھکاری نہ سمجھ

سگِ آوارہ کی آواز میں آواز ملا
رات کو رات سمجھ وقت گزاری نہ سمجھ

میں گزر جاؤں گا مقتل سے بگولے کی طرح
تُو مرے رقص کو ظالم مری باری نہ سمجھ

○

ہمیں ہی در بدری کو بچانا پڑتا ہے
وگرنہ راہ میں کیا کیا ٹھکانہ پڑتا ہے

معافی چاہتا ہوں صاحبانِ دشت و دل
تمہیں پتہ ہے مجھے گھر بھی جانا پڑتا ہے

یہ لوگ اور طرح بات ہی نہیں سنتے
میں کیا کروں مجھے مجمع لگانا پڑتا ہے

میں اس لیے بھی ترے شہر میں نہیں آتا
قدم قدم پہ تعارف کرانا پڑتا ہے

جمالِ یار! محبت کے انتقام سے بچ
تجھے پتہ نہیں وعدہ نبھانا پڑتا ہے

○

زندگی اُس کی سرِ دشت بسر ہو جائے
جو تجھے ڈھونڈنے نکلے وہ شجر ہو جائے

عین ممکن ہے ابھر آئے ستارا ایسا
رات کے پنکھ جھڑیں اور سحر ہو جائے

میری کوشش ہے کہ میں دل نہ دکھاؤں تیرا
پھر بھی اے دوست! کوئی بات اگر ہو جائے

میں کبھی زندگی کہہ کر نہ پکاروں گا تجھے
زندگی کہتے ہیں اُس کو جو بسر ہو جائے

جس طرح پیاس میں روتا ہوا بچہ کوئی
کھلکھلا اٹھتا ہوں جب مصرعۂ تر ہو جائے

اس میں آباد پرندوں کی دعا ہے تابشؔ
یہ کرائے کا مکاں ہی مرا گھر ہو جائے

○

اپنی مٹی کا گنہگار نہیں ہو سکتا
تلخ ہو سکتا ہوں غدار نہیں ہو سکتا

میں نے پوچھا تھا کہ اظہار نہیں ہو سکتا
دل پکارا کہ خبردار نہیں ہو سکتا

جس سے پوچھیں ترے بارے میں یہی کہتا ہے
خوبصورت ہے وفادار نہیں ہو سکتا

اک محبت تو کئی بار بھی ہو سکتی ہے
ایک ہی شخص کئی بار نہیں ہو سکتا

اس لیے چاہتا ہوں تیری پلک پر سونا
میں کہیں اور نمودار نہیں ہو سکتا

ویسے تو عشق کا ہونا ہی بہت مشکل ہے
ہو بھی جائے تو لگاتار نہیں ہو سکتا

○
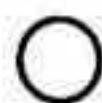
ہم نے چُپ رہ کے جو اک ساتھ بِتایا ہوا ہے
وہ زمانہ مری آواز میں آیا ہوا ہے

غیر مانوس سی خوشبو سے لگا ہے مجھ کو
تو نے یہ ہاتھ کہیں اور ملایا ہوا ہے

تم نہ مانو یہ مگر اپنے خدا کو میں نے
صرف دیکھا ہی نہیں ہاتھ لگایا ہوا ہے

میں نے جس سے کبھی مجنوں کا پتہ پوچھا تھا
اب وہ صحرا مری دہلیز پہ آیا ہوا ہے

قامتِ یار سا مصرعہ جو کبھی ہو سرزد
لوگ کہتے ہیں کہ مضمون اُٹھایا ہوا ہے

میں اُسے دیکھ کے لوٹا ہوں تو کیا دیکھتا ہوں
شہر کا شہر مجھے دیکھنے آیا ہوا ہے

○

دیکھیں ہمیں جو شور ضروری سمجھتے ہیں
چپ بھی ہیں اور بات بھی پوری سمجھتے ہیں

اَشکوں کو درمیان میں لائے بغیر ہم
حیرت ہے حاضری کو حضوری سمجھتے ہیں

دنیا تو اپنے ہونے کی جو بھی دلیل دے
ہم لوگ اس کو غیر ضروری سمجھتے ہیں

یہ جو غزل کے عشق میں غزلا گیا ہوں میں
اس مسئلے کو چند وفوری سمجھتے ہیں

مدت سے ہو رہی ہے غزل، ہو رہے گی کیا
اَب تک تو حال یہ ہے ادھوری سمجھتے ہیں

سچ کہہ رہے ہو آپ کہ مشروط کچھ نہیں
ہم پھر بھی ایک بات ضروری سمجھتے ہیں

اب تک تو وہم ہی کے سہارے چلا ہے عشق
وہ قرب ہی نہ ہو جسے دُوری سمجھتے ہیں

ایک مدت سے مری ماں نہیں سوئی تابشؔ
میں نے اک بار کہا تھا مجھے ڈر لگتا ہے